ڈاکٹر انوار احمد

امیر خسرو کا پیش رو ملتان کا عبدالرحمٰن اور اُس کی لازوال تصنیف۔ 'سندیس راسک'

'Sandes Rasak' (Sandes means message and Rasak or Rasu means epic or ballad) is a love poem, composed by Abdul Rehman a Muslim son of Hindu weaver of Multan 11th century poet has created this lyrical ballad, portraying the inner feeling of newly wed bride, whose spouse has to go far away for economic compulsions. The language of this poem is Apbharansh, spoken and written around Multan. Analytical and lingual study of this manuscript can extend the meaning of early Tradition of Urdu. Such study can reveal the lingual affinity between Multani and Urdu. The writer has introduced Urdu Translation of this books, while collecting and analyzing the evidences about the poet and Poem, which reflects the cultural and literary past of Multan as well.

ہمارے ہاں بہت سے علماء کا اسلوب اور استدلال ایک خاص طرح کے تعصب سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اہلِ ملتان شاکی ہیں کہ اُن کی تاریخی، تہذیبی اور ادبی شناخت کے ہر حوالے کو نامعتبر اور مشکوک بنا دیا جاتا ہے اس کی تازہ مثال مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور (المعروف ڈاکٹر وحید قریشی، اکیڈمی) سے 2006ء میں شائع ہونے والی محمد انصار اللہ کی کتاب "تاریخ ارتقاء زبان و ادب (پہلا حصہ)۔ ابراہیم لودھی کے عہد تک" ہے جس میں سندیس راسک کے مصنف کی ملتان سے نسبت کی تردید وکیلِ استغاثہ کے طور پر کی گئی ہے۔

> "سندیس راسک کے مصنف نے اپنے باپ کے مسکن کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ مغرب کی سمت میں زمانہ قدیم سے مشہور ملیچھ نامی ایک ملک ہے۔ کتاب میں ضمناً ایک جگہ "مول، ستھان" نامی مقام کا ذکر بھی آیا ہے۔ ان دونوں کو ملا کر یہ مفروضہ قائم

کرلیا گیا ہے کہ مصنف ملتان کا رہنے والا تھا۔ اس مفروضہ کی بنیاد یہ تھی کہ:

الف) جدید ہندی کے بدوانوں کے زعم میں زمانہ قدیم سے مسلمانوں کو ''ملیچھ'' کہا جاتا تھا اور

ب) ملتان پر مسلمانوں کا بہت پہلے قبضہ ہو چکا تھا' اس لیے وہ مسلمانوں کا ملک یعنی ملیچھ دیس ہو گیا۔

حالانکہ تمام حالات اور قراین اس کے برخلاف موجود تھے۔ شمال اور جنوب میں مختلف علاقے ایسے تھے جن کو ملتان سے بہت پہلے مسلمان اپنا مسکن بنا چکے تھے۔ مسلمانوں سے قدیمی تعلق کی بنیاد پر ہی اگر کسی ''ملیچھ دیس'' کی جستجو مقصود تھی تو ملتان کو ہرگز کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ پھر یہ بات بھی سمجھنے کی تھی کہ مصنف نہ صرف خود مسلمان ہے بلکہ اس کے باپ کا نام میں کلمہ ''میر'' کی شمولیت اس حقیقت کی بھی غماز ہے کہ اس کے اسلاف بھی مسلمان تھے۔ ایسا شخص مسلمانوں کو یا مسلمانوں کے ملک کو ''ملیچھ'' نہیں کہہ سکتا تھا۔

ترپاٹھی جی (وشوناتھ ترپاٹھی) نے الفاظ میں احتیاط برتتے ہوئے ''ملیچھ دیس'' کے معنی ''غلط مذہب کا ملک'' بتایا ہے۔ یہ سامنے کی بات تھی کہ عبدالرحمان کے لیے غلط مذہب کون سا ہو سکتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ ملیچھ دیس سے عبدالرحمان کی مراد بنارس شہر سے ہے جو مسلمانوں کے دور اقتدار میں ہندو مذہب کا مرکز بنا رہا اور جس کے ''مول استھان'' ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس شہر کے بارے میں شاعر نے جو لائق توجہ اطلاعات فراہم کی ہیں' یہ ہیں:

الف) وہ زمانہ قدیم سے نہایت مشہور ہے۔

ب) وہاں شاعری کی روایت قدیم ہے۔

ج) وہاں مختلف بولیوں کے عالم اور شاعر جمع رہتے تھے مختلف زبانوں کا بیان کرتے ہوئے شاعر نے اپ بھرنش، سنسکرت پراکرت اور پیشاجی وغیرہ کا نام لیا ہے۔

د) وہاں درختوں پر کوئل بولتی تھی اور پودوں پر پھول کھلتے تھے۔

ملتان میں ان میں سے کوئی ایک بات بھی موجود نہیں تھی۔ مسلمانوں کے اس شہر کے بارے میں جو بات مشہور تھی وہ یہ تھی کہ

چار چیز است تحفہ ملتان گرد و گرما، گدا و گورستان [ص۹۱]

ملتان کی قدامت وہاں عالموں اور شاعروں کا اکٹھا ہونا اور وہاں کے معروف (آم کے) درختوں پر کوئل کے بولنے سے انکار کے لیے بہت ہی زیادہ متعصب نظر اور تنگ دل چاہیے جو لاہور سے شائع ہونے والی ایسی بعض کتابوں کے اسلوب اور طرز استدلال کی بدولت میسر آ جاتا ہے۔

تاہم اس حوالے سے تحقیق کرنے والے بعض اصحابِ علم ایسے بھی ہیں جنہوں نے داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر کم از کم تین نکات پر اتفاق کیا ہے۔

Scanned by CamScanner

1۔ شاعر کا نام عبدالرحمٰن تھا جو ایک جولا ہے میر سین کا بیٹا تھا۔

2۔ یہ شاعر ملتان سے تعلق رکھتا تھا۔

3۔ سندیس راسک شہاب الدین غوری کے زمانے سے ذرا پہلے کی تصنیف ہے۔

شری جیناوجے منی جنہوں نے اسے ۱۹۴۵ء میں مرتب کر کے شائع کیا تھا اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''راسک میں دیئے گئے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت ہندوستان کے شمال، مغرب میں واقع ملتان ہندوؤں کے مقدس مقامات کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہاں پر موجود سورج دیوتا کا مندر اور سورج کنڈ پورے ہندوستان میں مشہور تھے اور یہ شہر ملتان ایک ترقی کرتا خوشحال شہر تھا۔ سندیس راسک سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ابھی اس شہر پر غیر ملکی حملہ آوروں کا سایہ نہیں پڑا تھا۔ یہ تو شہاب الدین کے حملے کے بعد ہوا کہ ملتان کی (ہندوانہ) شان معدوم ہوگئی۔ پھر کھمبات (کمبے) اور آج کی جیسلمیر ریاست میں موجود وجے نگر یا وکرم پورا کا ذکر بھی اہم ہے جو ملتان سے بہت دور نہیں۔ اس نظم میں قاصد بھی ملتان سے کھمبات جا رہا ہے۔'' [سنگھی جین سیریز، نمبر ۲۲، دی سندیس راسک آف عبدالرحمٰن، (دیباچہ)، ص ۱۲]

اسی طرح برہنی کو ملنے والا قاصد بھی ملتان سے کھمبات (کمبے) جا رہا ہے جو گجرات میں ہے اور جس کی خوشحالی بھی شہاب الدین غوری کے حملے سے پہلے قائم تھی جس سے منی جی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ راسک بارہویں صدی کے نصف آخر یا زیادہ سے زیادہ تیرہویں صدی کے نصف اول میں لکھا گیا۔ [ص ۱۳] یہاں یہ واضح رہے کہ منی جی بکرمی سال یا سمت کا ذکر کر رہے ہیں جو عیسوی سال سے ستاون برس قبل (۱۸ ستمبر بروز جمعرات) شروع ہوا۔ گویا سندیس راسک کے اس اہم مرتب نے اس کا جو زمانہ تخلیق متعین کیا ہے اُسے ہم عیسوی سال میں سمجھنا چاہیں تو ہم کہیں گے کہ سندیس راسک بارہویں صدی عیسوی میں تخلیق ہوا۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنی کتاب ''شمالی ہند کی بولیوں اور بھاشاؤں میں بارہ ماسہ کی روایت'' (نئی دہلی - ۲۰۰۵ء) میں سندیس راسک کا عہد تخلیق متعین کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ابدرمان یا عبدالرحمٰن کے سندیس راسک کی روایت سے چنداین کے خالق ملا داؤد ضرور واقف تھے۔ [ص ۲۶]

چنداین کا زمانہ تصنیف بقول ڈاکٹر تنویر علوی ۷۸-۷۷۷ھ ہے جو عیسوی سال ۷۳-۱۴۷۲ بنتا ہے گویا بہر صورت یہ تصنیف فیروز شاہ تغلق کے عہد (۷۵۲ھ-۷۹۰ھ- بمطابق ۱۳۵۱ء-۱۳۸۸) سے پہلے کی ہے جبکہ R. Allchin نے اپنی مرتبہ کتاب "Kavitavali by Tulsi Das" (New York 1984) میں عبدالرحمٰن کا زمانہ گیارہویں سے تیرہویں صدی تک کا بتایا ہے۔ [ص ۵۵]

وجے منی نے ایک اور قیاس بھی پیش کیا ہے کہ عبدالرحمٰن اگر ملتان کا نہیں بھی ہے تو اُس نے ہندو

Scanned by CamScanner

مذہب اور ثقافت اور راسک میں استعمال ہونے والی زبان سے گہری شناسائی کے لیے ہندو ثقافت کے کسی اہم مرکز میں بہت عرصہ قیام کیا اور مہارت حاصل کی اور غالباً یہ جگہ ملتان ہے۔[ص ۱۳]

عبدالرحمٰن کے بارے میں زیادہ تر علماء نے یہ قیاس پیش کیا ہے کہ وہ اپنی ماں بولی یعنی پراکرت سے تو آگاہ تھا ہی وہ سنسکرت سے بھی بخوبی واقف تھا اور پھر جس ادبی اپ بھرنش میں اُس نے سندیس راسک لکھی اس پر بھی اسے مہارت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نظم کے متن میں وہ لفظ اور وزن استعمال کرتا ہے جو سنسکرت میں نہیں اور جو اپ بھرنش میں بھی نہیں۔

جبکہ ڈاکٹر محمد حسن ''قدیم ادب کی تنقیدی تاریخ اٹھارویں صدی تک (اُتر پردیش: اُردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۶ء) میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن جس ملیچھ دیس کا رہنے والا تھا دراصل ملتان تھا۔''[ص ۴۲]

ڈاکٹر محمد حسن نے ہی کے ایس بیدی کا حوالہ دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''عہد قدیم ایک ہزار سے پندرہ سو تک یہ مسلمہ ہے کہ اس عہد سے پیشتر پشاچی، اپ بھرنش میں لکھنا باعث فخر محسوس کرتے تھے۔ سب سے پہلے ملتان کے باشندے عبد الرحمٰن نے سندیش راسک لکھا۔ اس زبان کو اپ بھرنش کی آخری شکل یا موجودہ پنجابی یا اپ بھرنش کی درمیانی کڑی خیال کرنا چاہیے۔ درحقیقت یہ زبان موجودہ پنجابی یا اپ بھرنش کی درمیانی کڑی تھی۔ عبدالرحمٰن 1010ء عیسوی میں اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلامی دائرے میں آچکا تھا۔''[ص ۴۳]

اسی طرح ''عہد وسطیٰ کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصہ'' (پٹنہ ۱۹۹۵ء) میں پروفیسر سید حسن عسکری لکھتے ہیں:

> ''زبان و بیان اور دوسری خصوصیات کے اعتبار سے بہت اہم ایک اور چھوٹی منظوم کتاب ہے۔ جو ۱۲-۹۱۱ء سے قبل بالکل مفقود تھی۔۔۔ اس شاعر کا نام عبدالرحمٰن ابن میر سین تھا۔ شاید ایک نومسلم خاندان کا فرد تھا۔ جس کا تعلق ہندوستان کے شمال و مغربی علاقوں بالخصوص ملتان جیسلمیر اور اطراف سے تھا۔ پیشہ کپڑا بُنتا تھا۔ ہندوؤں کی بھاشاؤں ان کے تہذیب و تمدن، ریتی رواج، روایات، جذبات کا اس پر بہت گہرا اثر تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی لیکن نہایت دلآویز اور لسانی اعتبار سے بہت وقیع کتاب سندیس راسک پراکرت کی ارتقائی عوامی بولی گرام بھاشا یا اپ بھرنش میں غالباً بارہویں صدی وکرمی کے اواخر یا تیرھویں صدی کے اوائل میں منظوم کی۔''[ص ۵۸]

ساہتیہ اکادمی، دہلی نے انسائیکلوپیڈیا کے طرز پر "A History of Indian Literature" شائع کی ہے جس کی جو جلد سن 500 سے 1399 تک کے دور کا احاطہ کرتی ہے اُس میں Sisir Kumar Das لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

''ملتان کے ادھی مان یا عبدالرحمٰن کی سندیس راسک وہ تصنیف ہے جو گیارہویں صدی میں اُس سے تخلیق کرائی گئی۔ تاہم بعد کے محققین کا کہنا ہے کہ یہ بہت بعد کی تصنیف ہے۔ یہ محبت کا ایک خوبصورت بیانیہ ہے۔ جس کی سنسکرت میں دو تفسیریں بھی ملتی ہیں۔ دیویدی کا کہنا ہے سندیس راسک اب بھی ملتان کے گردونواح میں گائی جاتی ہے اور حقیقت میں ملتان ہی ہیر رانجھا اور پورن بھگت جیسے محبت کے قصوں کی غنایت کو محفوظ کرنے والا خطہ ہے۔''

(Sandes-rasak written by Addahman or Abdul Rehman of Multan was assigned to write in the eleventh century. Bus later researches show that it is a much later day composition. It is a beatiful love narrative which had two Sanskrit commentaries. Dewivedi observes that the Sandes-rasak is still sung in the neighbourhood of Multan and in fact Multan has been the birth place of several love ballads such as Hir-Ranjha Ki Kahani and Puran Bhagat Ki Kahani.") [P. 212]

یہ اور بات کہ قیامِ پاکستان کے بعد کی جذباتی فضا میں بہت کچھ مٹ گیا یا مٹا دیا گیا اب ملتان کے گردو نواح میں عسکریت پسندوں کے مدرسے تو ہیں مگر محبت کی نظموں کی گونج کم ہو چکی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عبدالرحمٰن کے حوالے سے بہت ساری تواریخ اور تواریخ ادب میں کچھ الجھاؤ ملتا ہے جیسے ''ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ'' [کراچی ۱۹۸۵ء] میں ڈاکٹر سہیل بخاری نے، ''ہندی کے مسلمان شعراء'' [دہلی، ۱۹۸۲ء] میں رتن پنڈوروی نے اور ''ہندی شاعری'' [الٰہ آباد، ۱۹۲۹ء] میں اعظم کریوی نے ایک اور عبدالرحمٰن یا رحمٰن کا ذکر کیا ہے جو اورنگزیب عالمگیر کے بیٹے شہزادہ محمد معظم کا منصب دار تھا، جس نے ہندی دوہے بھی لکھے اور اُس کی ایک کتاب ''یمک شتک'' بھی ہے۔ [علی الترتیب، ص ۸۳: ص ۲۶۸: ص ۸۱]

اسی طرح آلچلن نے تلسی داس کی کویتاولی [نیویارک، ۱۹۸۴ء] کو ایڈٹ (Edit) کرتے ہوئے لکھا:

''عبدالرحمٰن کی سندیس راسک غالباً گیارھویں سے تیرھویں صدی سے تعلق رکھتی ہے اور مقامی زبانوں میں کسی مسلمان مصنف کی بچ جانے والی پہلی تصنیف ہے۔'' [ص ۵۵]

Scanned by CamScanner

مگر سنسار چندر نے اپنی کتاب "Some Prominent Muslim Hindi Poets" [Delhi, 1986] میں عبدالرحمٰن کے بارے میں لکھا۔

''کچھ علماء ملیچھ دیس کو مغربی پاکستان بلکہ اس سے بھی آگے کا قرار دیتے ہیں۔'' [ص ۱۴]

انہوں نے ہی ڈاکٹر شلیش زیدی کے حوالے سے عبدالرحمٰن کے والد میر سین کو میر حسین بنا دیا ہے اور ملیچھ دیس کو مشہد جو ایران کا مشہور شہر ہے یہی نہیں بلکہ میر حسین کے بارے میں کہا کہ یہ شہاب الدین محمد غوری کی فوج میں خدمات انجام دیتا رہا اُس کے ساتھ پہلے پشاور پھر ملتان اور آخر کار دہلی آیا اور پھر کچھ عرصے بعد قطب الدین ایبک نے اُسے اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ کا داروغہ بنا دیا اور وہ اجمیر میں ہی ۱۲۱۳ء میں فوت ہوا۔ [ص ۱۴]

دراصل یہ سارا ماجرا ملتے جلتے ناموں کا ہے اور پھر قیاس کے گھوڑے کو بے لگام دوڑایا جائے تو یہی کچھ ہو سکتا ہے جو ڈاکٹر شلیش زیدی نے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب تک کا بنیادی اور مقدم ترین حوالہ تو خود اس شاعر کی طرف سے فراہم ہوتا ہے جب وہ اپنے بارے میں اپنے والد اور اپنے وطن کے بارے میں کچھ معلومات دیتا ہے۔ دوسرا حوالہ اس متن کے تین نسخوں کو پہلی مرتبہ جین مت کے بھنڈاروں سے دریافت کر کے اسے مرتب کرنے والے جیناوجے منی کا ہے اور پھر زیادہ سنجیدہ محققین اور علماء کے قیاس کا ہے جن میں مَیں سید حسن عسکری، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی کو شامل کرتا ہوں۔

سندیس راسک سے داخلی شہادتیں:

i. مغرب میں پرانے زمانے سے طاقت ور اور مشہور جو ملیچھ ملک ہے (کافروں کا ملک ہے) اُسی ملک میں میر سین نامی شخص کے ہاں آرددو پیدا ہوا۔

۴۔ تَه تَن او كُلْكَمُلُوپا اے يَكْ وَوَيْسُ گِيَ وِسيے سُ
اَدْدَهُ مان پَسِددهو سنيه راسك رايْنُ

تَه تَن ۔اس کے بیٹے۔او۔جو۔کل۔خاندان۔کملو۔شان۔پا اے يك۔ پراکرت۔مقامی زبان۔ وَوَيْسَ گوی ۔گیت کا شاعر۔اددهمان۔عبدالرحمٰن۔پَسِدَده۔مشہور۔ سنیه ۔پیام۔راسك۔ طائفے کی شکل۔رایــــ۔تخلیق کی گئی۔اس کے بیٹے عبدالرحمٰن نے سندیس راسک تخلیق کی جو پراکرت شاعری اور گیتوں کی سلطنت میں اپنے خاندان کی شان تھا۔

جیسا میں نے پہلے ذکر کیا کہ یہ ترجمہ پروفیسر سید اصغر علی شاہ نے کیا انہوں نے آرددو کو میر سین کے بیٹے کا نام کہا اور یوں میر سین کو عبدالرحمٰن کا دادا بنا دیا، اُن کے احترام کے باوجود میں اختلاف کی جسارت کر رہا ہوں اور پروفیسر C.M. Mayrhofer کے انگریزی ترجمے کو بیشتر مقامات پر زیادہ مستند خیال کرتا ہوں، یہاں Ardda کا مطلب بیٹا بتایا گیا ہے۔

ii. میرے قصبے کا نام سامورا ہے۔ اس قصبے کے آدمی خوشی سے مگن اور شادمان ہیں۔ اے ماہرو! اس

Scanned by CamScanner

(قصبے) کی عمارتیں اُجلی (قلعی کی ہوئی) ہیں اور قلعہ بندیاں مضبوط۔ اس میں کوئی بھی جاہل نہیں دیکھا جاتا بلکہ ہر ایک آدمی عالم فاضل ہے۔

iii. اگر بہت سے تجربہ کار لوگوں کا گروہ ادھر کا سفر کر کے اسے دیکھے تو یقیناً پراکرت زبان میں خوش کن بحروں اور میٹھی آوازوں میں انہیں نظمیں سنائی جائیں گی۔ یہاں ایک جگہ کچھ چار ویدوں کے ماہر وید کی شرح کر رہے ہوں گے اور دوسری جگہ بہت سی شکلوں میں بنائے گئے راسک گیت پڑھے جا رہے ہوں گے۔

iv. اے ہرن کی آنکھوں والی خاتون، تپانا چوک ہر جگہ مشہور ہے، اس کا دوسرا نام ملستھان ہے (ملتان) جو تمام دنیا میں بہت معروف ہے وہاں سے میں اکیلا کسی کا لکھا ہوا خط لے کر کھمبایت چوک کی طرف بطور پیام بر بھیجا گیا ہوں۔ اس طرف مجھے اپنے مالک کے حکم سے سفر کرنا ہے۔

v. پیو کی آواز (جو پیا۔ محبوب سے مشابہ ہے) مادہ کا نکا گا کر پیدا کرتی تھی (وہ) نئے بادلوں کی خواہش مند تھی۔ ایک چھوٹی اور صاف پانی کی ندی بہتی ہوئی دریاؤں میں جاتی تھی پھلوں کے بوجھ سے جھکا ہوا آم کا درخت شاندار تھا جو آندھی میں ہاتھی کے کانوں کی طرح ہل رہا تھا۔۔۔۔۔۔ اس کے پتوں میں چھاتی سے لگے آم کے درخت سے محبت کرنے والے طوطوں کی ٹولی فاصلے اور وقفے بغیر اکٹھے رہتے تھے۔ دیکھو کلیاں جھولیں تو ان سے نرم اور گداز آواز پیدا ہوتی تھی۔ آم کے درختوں کے اس جھنڈ نے مسافر، مجھے بے سہارا اور کمزور بنا دیا۔

vi. سہانجنہ کے درختوں نے بھی (اپنے خوش کن سرخ رنگ کے باوجود) ناخوشی ہی پیدا کی۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ ایک تو ملستھان کا حوالہ متن میں ہی آ گیا ہے۔ دوسرے کوئی بھی شخص جو ملتانیوں کے بارے میں معمولی واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ سہانجنہ اُنہیں کتنا عزیز ہے بلکہ ملتانی اُسے خیال ہی نہیں کیا جاتا جو رغبت سے اسے کھاتا نہ ہو اور وہ خاتون ملتانی نہیں جو اسے پکا نہ سکتی ہو یعنی اس کی کڑواہٹ کو ذائقے میں بدل نہ سکتی ہو۔ اسی طرح ملتان آموں کے لیے بھی صدیوں سے معروف ہے اور آموں کے درخت کا اور اُس پر کوکتی کوئل کا حوالہ بھی متن میں موجود ہے، اس کے علاوہ جب برہن موسموں کا ذکر کرتی ہے تو پھر گرمی کے موسم کا جس خصوصیت سے ذکر ہوتا ہے کہ وہ اپنی چھاتیوں پر صندل کا لیپ کرتی ہے تو ٹھنڈک نہیں پڑتی کہ صندل کو بھی سانپوں نے ڈس رکھا تھا یہی نہیں بلکہ اس موسم میں دودھیا بدن کا سنولا جانا اور جسم میں سے طاقت کا نکل جانا یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ شاعر کا مرکزی تخلیقی حوالہ ملتان کا ہے۔

C. M. Mayrhofer نے یہ بات وثوق سے لکھی ہے کہ نہ صرف سندیس کے حوالے سے بلکہ شعری نغمگی، فطرت کا انسانی جذبات پر براہِ راست اثر اور داخلی آہنگ و تشبیہات کے حوالے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مہاکوی کالی داس کے میگھ دُوت کا اثر سندیس راسک پر ہے، حالانکہ میگھ دُوت میں بچھڑا ہوا مرد ہے جو اپنی باوفا بیوی کو یاد کرتا ہے اور میگھ یا بارش کو قاصد بناتا ہے اور موسموں کے تغیر کے باوجود

Scanned by CamScanner

اپنے اضطراب اور خود سے بچھڑی ہوئی کی کیفیت کے کرب کو پیش کرتا ہے۔ سحر اوجینی نے اس شاہکار نظم کا منظوم ترجمہ کیا ہے اُس کے چند بند ملاحظہ کریں۔

اپنی بیوی کی فرقت میں
کافی لاغر ہو جانے سے
سونے کا کنگن گرنے سے
سونا سونا ہاتھ تھا اس کا

[دہلی، ص ۱۷]

دوست، میرے بتائے نشانات سے
اور دروازے کے دونوں جانب بنیں
شنکھ کی اور کنول کی جو تصویریں ہیں
اُن سے پہچان لے گا تو میرا محل
آہ میرے نہ رہنے سے اس وقت میں
وہ اُداسی میں ڈوبا نظر آئے گا
کیونکہ سورج کے چھپ کر چلے جانے پر
خوبصورت کنول کی مہکتی ہوئی
شوخ رنگینیاں ماند پڑ جائیں ہیں

[ص ۸۲، ۸۳]

اپنے پریتم سے، ساتھی سے بچھڑی ہوئی
ایک چکوی کی طرح نصیبوں جلی!
کم سخن، پھر اکیلی، سُلگتی ہوئی
ایسی بیتاب و مغموم محبوبہ کو
تو مرا دوسرا روپ ہی جاننا!
ہجر کے لمبے لمبے دنوں کے سبب
آرزؤں کی بیتابیوں کے سبب
خواہشِ وصل کے ہاتھوں لٹنے پہ اب
میں سمجھتا ہوں پالے مارے کنول
کی طرح زرد سی ہوگئی ہوگی وہ

[ص ۸۴، ۸۵]

Scanned by CamScanner

اے سہاگن - مجھے اپنے شوہر کا تم
دوست سمجھو، کہ میں واقعی دوست ہوں
اُس کا پیغام دل میں چھپائے ہوئے
ہاں، تمہارے ہی تو پاس آیا ہوں میں
میں وہی میگھ ہوں - جو مُدھر، رس بھری
پُر وقار اور سنجیدہ آواز سے
گھر پہنچنے پہ آمادہ کرتا ہوں اور
ہر ''مسافر پیا'' کو یہ سمجھاؤں ہوں

[ص۹۵]

تو مجھے دوست یا غمزدہ جان کر
غمزدہ اور بچھڑا ہوا مان کر
اپنے جذباتِ رحم و کرم کے سبب
میرے اِس کام کو پورا کر ڈالیو
اس کے بعد اپنی برسات کے حسن سے
اور بھی رنگ میں حسن میں ڈوب کر
اپنی من چاہی راہوں پہ ہی گھومنا
میری یہ آرزو، یہ دعا ہے کہ تو
اپنی محبوبہ (بجلی) سے پل بھر کو بھی
جیسے بچھڑا ہوں میں تو نہ بچھڑے کبھی

[ص۱۰۵]

سندیس راسک کے شعری محاسن:

اس کے تمام تر محاسن کی تحسین اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے بحور کے پورے نظام کو نہ سمجھا جائے بلکہ متن کے بھی اُلجھے ہوئے املا اور حروفِ تہجی، اختلافِ نسخ، پراکرت، اپ بھرنش، سنسکرت اور پشاچی کے مابہ الامتیاز لسانی خصوصیات سے واقفیت نہ ہو مگر اِس میں کوشش کی گئی ہے کہ جہاں ایک پروفیسر صاحب (اصغر علی شاہ) مشکل الفاظ کے معنی بھی دیں اور ساتھ ہی ساتھ سنسکرت سے لفظی ترجمہ بھی کرتے جائیں اور دوسری طرف ایک ریسرچ سکالر (نازیہ بخاری) انگریزی متن سے علیحدہ سے ترجمہ کرے بظاہر ان دونوں ترجموں میں بعض مقامات پر عدم مطابقت ہے مگر کوشش کی گئی کہ اِس متن کی تفہیم کے امتیازات اُجاگر کرنے کے لیے اِس عدم مطابقت کو برقرار رکھا جائے۔

Scanned by CamScanner

اس نظم کے آغاز میں شاعر نے جو پیرایہ بیان اختیار کیا اُس میں بڑے بڑے تخلیق کاروں کے عظیم کارناموں کا اعتراف کرنے اور اظہارِ انکسار کے باوجود ہر نو مشق کے جوازِ تخلیق کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔

- اگر رات میں چاند نکلا ہوتا ہے تو کیا گھر میں رات کو چراغ نہیں جلائے جاتے؟
- اگر درخت کی چوٹی پر بیٹھ کر پپیہے جذبات بھرے خوش کن گیت گاتے ہیں تو کیا گھر کی (منڈیروں) پر کوے کائیں کائیں نہ کریں؟
- اگر نازک انگلیوں کے ساتھ ساز کے تاروں کی آواز بہت پسندیدہ ہے تو کیا خوشیوں کے مواقع پر ڈھول کی آواز کو نہ سنا جائے؟
- اگر میرکل (دنیا) کو مدد دینے والے چار ہاتھیوں میں سے (ایک) مدھ (شراب) کی خوشبو کمل کے پھولوں کی مانند دیتا ہے۔ ایک کم یاب منفرد یا اگر ایراوتا گردش میں نہیں تو کیا دوسرے ہاتھی بھی گردش میں نہ ہوں؟
- اگر پارجات نامی بہشتی درخت پر مختلف قسم کی خوشبوؤں والے پھول اندر کے محل میں مہکتے ہیں تو کیا دوسرے درختوں کے پھول نہ مہکیں؟
- اگر ایک شاندار جھیل میں سورج کے کھلنے کے وقت کنول کھلتا ہے تو باڑی میں لگا ہوا کدو کا پھول جی بھر کے نہ کھلے؟
- اگر ایک نوجوان دوشیزہ خوب صورتی کے ساتھ کپڑے پہن کر مہارت کے ساتھ بھرت منی ناچ ناچتی ہے تو کیا گاؤں کی لڑکی تالی بجانے والے ہاتھوں کی تال پر نہ ناچے؟
- اگر چاولوں کی بنائی ہوئی کھیر جس میں بہت دودھ ملا ہوا ہو، گرمی سے اُبلتا ہے تو کیا اناج کا چھان ملا کر بنایا ہوا دلیا بلبلے پیدا نہ کرے؟
- ایک آدمی میں جو بھی شاعرانہ قابلیت ہے اُسے بغیر کسی شرم کے اُس کا اظہار کرنا چاہیے اگر برہما بول چکا ہے تو کیا باقی (خدا) نہ بولیں؟

اس کے بعد شاعر ایک باکمال مصور کے طور پر سامنے آتا ہے جو ایک خاتون کی جذبات سے مرتعش دلکش تصویر بناتا ہے، جس میں اُس کے انگ انگ کی جزئیات بیان کرتا ہے مگر اِس طرح کہ اُس کی روح کی لطافت یا پاکیزگی پر تب بھی آنچ نہیں آتی جب کبھی اُس کے حسن و جمال کے مراکز کو ڈھانپنے والے ہاتھ، کپڑے یا حجابات اِدھر سے اُدھر ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر شاعر کے اظہار کی فکری سچائی ایسی نقش گری کرتی ہے کہ لذت، ابتذال میں تبدیل نہیں ہوتی۔

- اس کے پیٹ کے درمیان ناف کا گہرا گڑھا۔ پہاڑی ندی میں بھنور کی مانند تھا۔ فانی خوشی کی طرح اس کی کمر چھوٹی اور لچکتی ہوئی تھی جو اس کی چال میں رکاوٹ کا باعث تھی۔

Scanned by CamScanner

- اس کی پنڈلیاں جالندھر (ایک درخت) سے چمک اور رنگ میں آگے نکل گئی تھیں۔ وہ بہت پیاری اور گول تھیں۔ رانیں بہت حسین اور خوش کن ہیں۔ ان سے لمبے عرصے تک لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔
- اس کے پاؤں کی انگلیاں اتنی چمک دار ہیں جیسے یاقوت سے بنی ہوں اور ان پر ناخنوں کی قطاریں بلوریں تھیں۔ اس کے جسم پر بالوں کی نرم لہر ایسے تھی جیسے خوف زدہ پھول ڈالیوں پر متحرک ہوں۔
- اس کے دونوں بازو نرم، لچکدار کنول کے تنے جیسے تھے جو دائمی امر جھیل میں اُگتا ہے۔ بازوؤں کے اختتام پر اس کے چھوٹے اور خوبصورت ترشے ہوئے ہاتھ یوں لگتے تھے جیسے کنول کا پھول دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہو۔
- اس کے گھنگریالے بال پانی کی لہروں کی مانند دھوکا دینے والے تھے۔ اپنی سیاہی میں بالوں کی لٹیں شہد کی مکھیوں کی قطاریں تھیں۔
- اس کی چھاتیاں دو سرکش درباریوں کی طرح تھیں۔ مضبوط ارادہ اور نافرمان۔ ہمیشہ اوپر اُٹھے ہوئے مگر گنگ اور بھرپور (ان میں کوئی فاصلہ نہ تھا) اختلاط کے وقت وہ دونوں اختلاط کرنے والوں کی تسلی کراتی ہیں۔ (وفاداری کا یقین دلاتی ہیں)

حالانکہ کبھی بھاگتے ہوئے اُس کا کمر بند نیچے گر جاتا ہے کبھی اُس کی چھاتیاں صندل کے لیپ کے بغیر بھی دکھائی دے جاتی ہیں اور کبھی اُس کے گداز بدن کے مدوجزر بیان کیے جاتے ہیں تاہم ایک پتی ورتا کی واردات اُس کے سراپا کو محض لذت کے حصول کا وسیلہ ثابت نہیں رہنے دیتا یا اُس کا ہیجان محض جسمانی نہیں رہتا بلکہ ایک روحانی کرب میں ڈھل جاتا ہے۔

- شمال کی طرف دن لمبائی میں بڑھتے ہیں تو جنوب میں راتیں۔ لیکن میرے پیارے جہاں یہ دونوں بیک وقت بڑھتے ہیں وہ خطہ جدائی کا ہے۔
- میرے لیے طویل رات آہوں کے ساتھ گزرتی ہے، تم جنگلی بے رحم شخص ہو۔ تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے نیند نہیں آتی۔ تم لٹیرے ہو۔ بے وفا شخص میرے سارے انگ تمہارے ہاتھ کے لمس سے محروم ہیں۔ میرا جسم جو سونے کا تھا، آتش دان کے بھڑکنے سے نہیں بلکہ موسم سرما کے جوبن پر آنے سے راکھ ہو گیا ہے۔ میرے محبوب میں تمہیں یاد کر کے روتی ہوں۔ کیا موسم سرما کے دوران نہ آؤ گے اور مجھے تسلی نہیں دو گے۔ نادان، وحشی، مجرم جب میں مر جاؤں گی اور تمہیں پتہ چلے گا کیا تم تب آؤ گے؟
- گہری آنکھوں والی خاتون کا حلق لمبی گرم آہوں کی وجہ سے خشک ہو رہا تھا اور وہ پیاس سے مر رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو ایسے گر رہے تھے جیسے بادلوں سے بھاپ بن کر پانی۔
- ماتم اور گرم آہوں سے میرا جسم خشک ہے۔ لیکن میرے آنسوؤں کے پانی کا سیلاب خشک نہیں

Scanned by CamScanner

ہوتا۔ میرا دل پرچھا ہے جو کسی دوسری سرزمین میں اُڑ گیا ہے یا چراغ پر گرے ہوئے پتنگے کی مانند ہے۔

- اس میں خواتین کے ملبوسات، زیورات وغیرہ کے ساتھ ساتھ اُن کے آرائش کے سادہ سامان کی بھی تفصیلات بڑی پر لطف محسوس ہوتی ہیں۔
- دیوالی کے روشن کردہ چراغ لوگ اپنے ہاتھوں میں چاند کی کرنوں کی مانند پکڑے تھے۔ گھروں میں دودھیا روشنیاں سجائی گئی تھیں۔ خواتین چراغ کی سیاہی کو کاجل بنانے کے لیے لکڑیوں کو استعمال کرتیں۔
- سیاہ ملبوسات میں نمایاں بہت سی پر شکن لہروں والے کپڑوں میں اُن کی چھاتیاں جو دائروں کی طرح گول تھیں۔ محبت کے خوش کن پیچ وخم کے ساتھ مشک میں مہکی ہوئی نمایاں ہو رہی تھیں۔
- ہر انگ پر گاڑھے زعفران سے نقش ونگار بنائے گئے تھے۔ اس زہر کی طرح جسے محبت کے دیوتا نے اپنے تیروں کے ذریعے پھینکا ہو۔ ان چھاتیوں نے اپنی نوکوں پر پھول سجائے ہوئے تھے۔ جو یوں لگتے تھے۔ جیسے ہلال کالے بادلوں کے مینار پر ٹکا ہوا ہو۔
- اپنی پیشانیوں پر رنگ دار پاؤڈر کے تلک لگانے کے بعد انہوں نے اپنی چولیوں پر زعفران اور سنتل چھڑکا۔ وہ سرمدا کو ہاتھوں میں تھام کر اس سمیت انہوں نے خدا کی تعریف میں خوش کن گیت گائے۔
- (خدمت کرنے والی عورتیں) یا مزدور عورتوں نے نہ کافور اور نہ ہی سنتل اُگایا تھا۔ ہونٹوں اور رخساروں کے لیے اُبٹن میں شہد کی مکھیوں کا بنایا ہوا موم ملایا جاتا تھا۔ سنتل سے پاک زعفران جسم پر لگایا جاتا تھا۔ مشک ملا کمپا تیل اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔
- ہومر کے بعض اشعار میں موجود تنقیدی بصیرت کو بعض ناقدین، مغرب کے تنقیدی سرمائے میں شامل کرتے ہیں مگر یہاں دیکھیئے عبدالرحمٰن نے خواص اور عوام میں سے اوسط ذہنی اور جمالیاتی احساس رکھنے والے قارئین کو اپنا مخاطب کہہ کے اس حوالے سے ایک اہم تنقیدی نکتہ پیش کیا ہے۔ ''عقل مند لوگ اس کے لیے نہیں ٹھہریں گے کہ یہ شاعری اُن کے نزدیک غیر معیاری یا گھٹیا ہے اور جاہل کی پہنچ سے یہ شاعری ویسے ہی باہر ہوگی کیونکہ وہ جاہل ہے۔ لیکن جو لوگ نہ عقل مند ہیں اور نہ بیوقوف بلکہ درمیانے ہیں اُن کے حلقے میں یقیناً یہ شاعری پڑھی جائے گی۔
- سندیس راسک ہندو کلچر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس میں جن تہواروں، مقدس کتابوں، اساطیری حوالوں اور ملبوسات کا ذکر ہے وہ ہندو معاشرے سے مخصوص ہیں۔ نظم کی ہیروئن کا اپنے محبوب سے جدائی پر اپنے جذبات کا بے باکانہ اظہار بھی دراصل ہندو تہذیب وادب سے مخصوص ہے کیونکہ ہندو ادب میں عورت کا کردار متحرک اور فعال ہوتا ہے۔ محبت کا اظہار عورت کرتی ہے۔ کرشن کا کام صرف بنسی بجا کر حسن کو عشق میں تبدیل کرنا ہے یوں گوپیاں کرشن کے گرد رقص کرتی ہیں۔ جو ظاہر

Scanned by CamScanner

ہے کہ رقصِ تن سے زیادہ رقصِ جاں ہے۔

سندیس راسک میں جہاں اس دَور کی تہذیب و معاشرت کا بیان ملتا ہے وہاں مصنف نے مختلف موسموں، پھولوں، پھلوں، درختوں اور پرندوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ فطرت کے یہ دلکش اور حسین نظارے بھی اس کے اپنے قصبے سے تعلق رکھتے ہیں کسی دوسری سرزمین سے نہیں۔ موسم بہار کی آمد پر درختوں کے کھلنے کا منظر دیکھیں:

- کیتکی درخت نے اپنے کھلنے کا حسین نظارا پیش کیا۔ جب یہ بہار پر ہوتا ہے تو یہ ہر طرف اپنی ہریالی سے مسرت بخشتا ہے۔ اس پر مختلف رنگوں کے نئے شگوفے اور پتے تھے۔

اس نظم میں اس نے تشبیہات کو کثرت سے استعمال کیا ہے مگر یہ کثرت گراں نہیں گزرتی کیونکہ شاعر نے انہیں بڑی خوب صورتی اور مہارت سے برتا ہے۔ عموماً جن چیزوں سے تشبیہ دی جاتی ہے وہ قاری کے لیے اجنبی نہیں ہوتیں تاکہ وہ اسے آسانی سے قبول کر لے۔ مشبہ بہ کا تعلق زیادہ تر فطری دنیا سے ہوتا ہے۔ سندیس راسک میں بھی فطرت کی رنگینیوں سے مدد لی گئی ہے مگر فطرت کے یہ مظاہر شاعر کے اپنے قصبے سے تعلق رکھتے ہیں:

- اس کے دونوں بازو نرم، لچک دار کنول کے تنے جیسے تھے جو دائمی امر جھیل میں اُگتا ہے۔ بازوؤں کے اختتام پر اس کے چھوٹے اور خوبصورت ترشے ہوئے ہاتھ یوں لگتے تھے جیسے کنول کا پھول دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہو۔
- اس کی پنڈلیاں جالندھر سے چمک اور رنگ میں آگے نکل گئی تھیں۔
- میرا دل پپیہا ہے جو کسی دوسری سرزمین میں اُڑ گیا ہے۔ یا چراغ پر گرے ہوئے پتنگے کی مانند ہے۔
- تمہارا بدن جالندھر کی طرح نازک ہے وہ شخص تمہیں ضائع کر رہا ہے جس کے لیے تم چنچل عورت کی چال ترک کر چکی ہو جو ہمسا پرندے جیسی ہے۔

برہن کی کمر کے مختصر ہونے کے لیے جو تشبیہ استعمال کی:

- فانی خوشی کی طرح اس کی کمر چھوٹی اور لچکتی ہوئی تھی۔

ایک اور جگہ پر لکھا:

- وجے نگر کی ابھری ہوئی نرم سخت چھاتیوں والی خوب صورت ترین خاتون جس کی کمر بھڑ کی طرح ہے اور چال راج ہنس کی مانند۔

اس کے بالوں کے پیچ و خم اور سیاہی کے بارے میں لکھا:

- اس کے گھنگھریالے بال پانی کی لہروں کی مانند دھوکا دینے والے تھے۔ اپنی سیاہی میں بالوں کی لٹیں شہد کی مکھیوں کی قطاریں تھیں۔
- اس کی چھاتیوں کی سرکشی اور نافرمانی کو سرکش درباریوں سے تشبیہ دی ہے جو شاعر کے تخیل کی

Scanned by CamScanner

بلند پروازی کی اعلیٰ مثال ہے:

- اس کی چھاتیاں دو سرکش درباریوں کی طرح تھیں مضبوط ارادہ اور نافرمان، ہمیشہ اوپر اُٹھے ہوئے مگر گنگ اور ان میں کوئی فاصلہ نہ تھا۔

آنکھوں سے آنسو گرنے کا منظر ملاحظہ ہو:

- اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اور ان سے آنسو ایسے گر رہے تھے جیسے بادلوں سے بھاپ بن کر پانی۔

سندیس راسک کا خلاصہ:

سندیس راسک میں نائیکا وجے نگر کی نوجوان خاتون ہے جس کا شوہر اسے چھوڑ کر کام پر چلا گیا ہے اور ابھی تک نہیں لوٹا۔ قاری اس سے اس وقت ملتا ہے جب وہ اپنے شوہر کا راستہ دیکھ رہی ہے اور تنہائی میں آنسو بہا رہی ہے۔ وہ سڑک پر ایک مسافر کو دیکھتی ہے۔ شرم کو بالائے طاق رکھ کر وہ مسافر کے پیچھے دوڑتی ہے اور اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ مسافر اس کی خوب صورتی کی تعریف کرتا ہے جس کے جواب میں وہ شرما جاتی ہے لیکن وہ برابر اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اب کہاں جا رہا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ وہ ''سمورا'' سے آیا ہے۔ پھر تفصیل کے ساتھ قصبے اور اس کے گرد و نواح کی خوب صورتی بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ملتان سے کھمبائیت تک جائے گا۔ وہ بتاتی ہے کہ یہی جگہ ہے جہاں اس کا شوہر ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ مسافر سے کہتی ہے کہ وہ تھوڑی دیر انتظار کرے تاکہ وہ اپنے شوہر کے لیے پیغام دے سکے۔ تب وہ اپنے محبوب کو جذباتی سرزنش کرتی ہے اور بہت کوسنے بھی دیتی ہے مگر والہانہ لگاؤ کے ساتھ۔ مسافر شائستگی سے اپنے سفر کو جاری رکھنے کی شدید ضرورت کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنا پیغام جلدی جلدی دے دو۔ لیکن وہ جذبات کی رو میں بہتی چلی جاتی ہے۔ جونہی دن ختم ہوتا ہے مسافر کو بار بار اسے خاموش کرانے کے لیے مداخلت کرنا پڑتی ہے اور اسے اپنا کام یاد دلانا پڑتا ہے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آخر کار وہ اس کی خوبصورتی کے آگے ہار جاتا ہے۔ (یا شاید اسے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ وہ اپنا سفر جاری نہ رکھ سکتا تھا) اور اس سے اس کے دُکھ کی وجہ پوچھتا ہے کہ اس کے محبوب نے اسے کب چھوڑا؟ خاتون نے جواب دیا کہ وہ اسے موسمِ گرما میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی موسم گرما کا بیان اور اس کے بعد آنے والے موسموں کی تفصیلات ہیں۔ تمام وقت وہ مسافر سے باتیں کرتی رہتی ہے اور اسے اپنی جسمانی اور ذہنی ابتری کے بارے میں بتاتی رہتی ہے۔ آخر کار وہ خاموش ہوتی ہے۔ اپنی ضد کے لیے معافی مانگتی ہے اور التجا کرتی ہے کہ وہ اس کے محبوب سے اچھے انداز میں بات کرے تب اسے جانے کی اجازت دے دیتی ہے اور جب خود جانے کے لیے مڑتی ہے تو اسی لمحے اپنے شوہر کو واپس آتے ہوئے دیکھتی ہے۔

Scanned by CamScanner

ماخذات

۱۔ کالی داس، میگھ دُوت، مترجم: سحر اوجینی، مشورہ بک ڈپو، دہلی،

۲۔ پنڈت محمد شفیع علوی کاکوروی، مسلمان حکمرانوں کی ہندی قدر دانی، لکھنو، ۱۹۸۶ء۔

۳۔ سید حسن عسکری، سندیس راسک اپ بھرنشائی، مشمولہ: عہد وسطیٰ کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۵ء

۴۔ رتن پنڈوروی، ہندی کے مسلمان شعراء، دہلی، ۱۹۸۲ء۔

۵۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ، کراچی، ۱۹۸۵ء۔

۶۔ لعل چند بسمل، پہلا مسلمان جس نے نانک لکھا، مشمولہ نوائے ادب بمبئی، جولائی ۱۹۶۵ء۔

۷۔ اعظم کریوی، ہندی شاعری، الہ آباد، ۱۹۲۹ء

۹۔ محمد انصار اللہ، تاریخ ارتقاء زبان وادب، پہلا حصہ ابراہیم لودھی کے عہد تک، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۶ء۔

۱۰۔ ڈاکٹر محمد حسن، قدیم ادب کی تنقیدی تاریخ، اٹھارویں صدی تک، اتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۶ء۔

۱۱۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، شمالی ہند کی بولیوں اور بھاشاؤں میں بارہ ماسہ کی روایت، شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء۔

۱۲۔ Some Prominent Muslim Hindi Poets by Sansar Chandra Delhi, 1986.

۱۳۔ "Kavitavali" by Tulsi Das ed. by R. Allchin New York, 1984.

۱۴۔ The Samdesaraska of Abdul Rehman, by C.M. Mayrhofer, Motilil Banarsidass Publishers, Delhi, 1998.

۱۵۔ The Samdesaraska of Abdul Rehman, by: Sri Jina Vijaya Muni & Prof. Harivallabh Bhayani, Bharatiya Vidya Bhavan, Bombay, 1945.

۱۶۔ A History of Indian Literature 500-1399, by Sisir Kumar Das, Sahitya Akademi, Delhi, 2005.

Scanned by CamScanner